© rasailojaraid

حافظ پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی

انکارِ حدیث

غلام احمد پرویز کے ایمان بالقرآن کی حقیقت

شیطان اس حقیقت سے خود واقف ہے کہ وہ اپنی دعوتِ ضلالت کو ضلالت کے نام سے اگر پیش کرے گا تو وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگی، چنانچہ وہ ہمیشہ یہ حربہ اختیار کرتا رہا ہے کہ وہ گمراہی کو ہدایت کے روپ میں پیش کرے۔ جھوٹ کو لباسِ صدق پہنائے، بے دینی کو دین کے بھیس میں سامنے لائے اور خلقِ خدا کو دھوکہ دینے کے لئے فریب کار کی بجائے ناصحِ دردمند کا بہروپ اپنائے۔ اگر وہ فساد کو صلاح کا نقاب نہ اوڑھے اور خود بے نقاب ہوکر سامنے آئے تو کوئی اس کے فریب میں نہ آئے۔ وہ اپنی شیطنت کو پارسائیت کے پردے میں پیش کرتا ہے اور یوں وہ ابنائے آدم کو اپنی مفاد پرستیوں کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ اس تکنیک سے وہ بنی نوع انسان کو جس تباہی و بربادی سے ہم کنار کرتا ہے اس کے سامنے ہلاکو اور چنگیز خان تو رہے ایک طرف، ہٹلر اور امریکی بُش کی تباہیاں بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔

نہ صرف تاریخ انسانیت بلکہ اسلام کی سرگذشت بھی اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ہر عصر و مصر میں ملحد اور بے دین لوگوں نے ہدایت کے نام پر ضلالت کو، اسلام کے نام پر بے دینی کو، سچ کے نام پر جھوٹ کو اور قرآن کے نام پر خلافِ قرآن افکار و نظریات کو پھیلانے کی مذموم کوششیں کی ہیں۔ اِن ہی کوششوں میں ایک کوشش وہ بھی ہے جو ہمارے دور میں مغربیت کی ذہنی غلامی اور اشتراکیت کی فکری اسیری میں مبتلا ہوکر چوہدری غلام احمد پرویز نے قرآنِ کریم کے نام پر دامِ ہم رنگ زمین بچھا کر کی ہے، اس کے نتیجہ میں مغربی معاشرت کے عادات و اطوار کو، اشتراکیت کے معاشی نظام کے ساتھ ملا کر اس قرآن کے نام پر پیش کیا ہے جس کے بغیر ہی ان سب اُمور کو عصر حاضر کی گمراہ قومیں پہلے سے اپنائے ہوئے تھیں۔

جناب غلام احمد پرویز تہذیبِ غالب کے یکے از خدامِ بے دام تھے یا زرخرید غلام تھے؟

© rasailojaraid

اسے ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں جو عالم الغیب والشہادہ اور علیم بذات الصدور ہے۔لیکن یہ بات بہرحال واضح ہے کہ جو کام مغربی ممالک کے ملحد فلاسفہ اور بے دین دانشور، مسلم معاشروں میں براہِ راست خود نہیں کرسکتے تھے، وہ کام ہمارے 'مفکرِ قرآن'، 'قرآنی دانشور' بن کر کر تے رہے ہیں۔ان کی پچاس سالہ 'قرآنی خدمات' کا مغز اور خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ زبان اپنی استعمال کرتے تھے مگر بولی غیروں کی بولتے تھے۔دماغ تو اُن کا اپنا تھا مگر اس میں فکر غیروں کی تھی۔ الفاظ تو وہ قرآن ہی کے استعمال کرتے تھے مگر ان کے پیکروں میں تصورات اشتراکیت اور مغربی معاشرت سے مستعار ومستورد تھے۔چنانچہ وہ اپنی جن 'قرآنی خدمات' پر گولڈن جوبلی مناکر سطحِ ارض سے بطن زمین میں منتقل ہوئے، ان پر یہودی علماء وپیشوا، نصرانی احبار ورہبان، الحاد ودہریت کے پُشتی بان، زندقہ وسیکولرزم کے علمبردار، سب خوش وخرم ہوکر ان کی تعریف وتحسین میں رطب اللسان ہوکر اُنہیں ہدیۂ تبریک اور گل ہائے تہنیت پیش کرتے ہیں۔ جب کہ عالم اسلام کے علماء بیک زبان ہوکر ان پر فتوائے کفر عائد کرتے ہیں۔

'مفکرِ قرآن' کی تعلّی آمیز انانیت

'مفکرِ قرآن' صاحب جس قدر قرآن، قرآن کی رٹ لگایا کرتے تھے، اُسی قدر وہ قرآن سے گریزاں اور کتاب اللہ سے کنارہ کش تھے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے مقابلے میں جملہ اہل علم کو قرآن سے بے خبر اور جاہل قرار دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انانیت کے ساتویں آسمان پر محوِ پرواز رہتے ہوئے وہ بلا استثنا تمام علماے کرام کے متعلق یہ اعلان کیا کرتے تھے:

''حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔''

(طلوعِ اسلام: جون ۱۹۵۶ء ص ٦)

ایک اور مقام پر علما کے خلاف بڑا تحقیر آمیز رویہ اپناتے ہوئے، لیکن غرور وتکبر کی انتہائی بلندیوں پر براجمان ہوکر یہ فتویٰ داغتے ہیں:

''ہمارا مُلّا طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب دلائل وبراہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لئے کہ یہ دعوت قرآن کی دعوت ہے اور مُلّا بے چارہ قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے۔)''

(طلوعِ اسلام: مئی ۱۹۵۳ء، ص ۴۷)

© rasailojaraid

ایک اور موقع پر اُسی اہانت آمیز لب ولہجہ میں جو علما کے خلاف ان کا مستقل وطیرہ تھا، یہ فرماتے ہیں:

''مُلّا کے پاس نہ علم ہوتا ہے، نہ بصیرت، نہ دلائل ہوتے ہیں، نہ براہین۔''

(طلوع اسلام: ۵ فروری ۱۹۵۵ء، ص ۴)

اور مولانا مودودیؒ جن کی گھٹیا مخالفت میں 'مفکرِ قرآن' صاحب مرتے دم تک پرویزی حیلے اختیار کرتے رہے ہیں، یہ فتویٰ ان کے متعلق داغتے ہیں۔

ایک اور مقام پر مولانا مودودیؒ کے خلاف یہ فتویٰ بھی رسید کیا گیا ہے:

''ہم مودودی کو نہ دین کا عالم مانتے ہیں، نہ کوئی مفکر۔'' (طلوع اسلام: جون ۱۹۵۳ء، ص ۶)

چنانچہ 'مفکرِ قرآن' صاحب اپنے عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں علماء کرام پر 'قدامت پرستی' کا لیبل لگا کر اپنے متعلق تعلّی آمیز خودستائی کا اظہار بایں الفاظ کیا کرتے تھے:

''جو کچھ میں قرآن سے پیش کرتا ہوں، اس کی تردید کے لئے چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے پاس دلائل و براہین نہیں ہوتیں، اس لئے وہ خود بھی مشتعل ہوتا ہے اور عوام کو بھی مشتعل کرتا ہے۔'' (طلوعِ اسلام: اگست ۱۹۷۳ء، ص ۳۶)

أعلم الناس بالقرآن کی پندار افزائی

'مفکرِ قرآن' صاحب خود أعلم الناس بالقرآن کے پندار میں مبتلا ہوکر یہی پندار اپنے نیاز مندوں میں بھی پیدا کیا کرتے تھے اور اُنہیں اس زعم میں مبتلا کیا کرتے تھے کہ تیرہ چودہ صدیوں بعد جو قرآنی آواز طلوعِ اسلام کے ذریعہ بلند ہو رہی ہے، آپ لوگ ہی اس کے واحد امین ہیں، باقی ساری دنیا اس آواز کا گلا گھونٹتی چلی آ رہی ہے۔

① تیرہ سو سال کے بعد پھر سے خالص قرآن کی آواز طلوعِ اسلام کی وساطت سے بلند ہونی شروع ہوئی ہے۔ (طلوعِ اسلام: نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۱۳)

② اس سرزمین سے تیرہ سو سال کے بعد پہلی بار قرآن کی آواز اُٹھی ہے اور قدرت کو یہ منظور ہے کہ تیرہ سو سال کے بعد ایک بار پھر قرآنی نظام اپنی عملی شکل میں سامنے آئے۔

(طلوعِ اسلام: نومبر ۱۹۵۴ء، ص ۱۱)

© rasailojaraid.

③ اس وقت ساری دنیا میں قرآنِ خالص کی آواز صرف آپ کی اس ننھی سی جماعت کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ (طلوعِ اسلام: دسمبر ۱۹۶۴ء، ص ۸۷)

④ صدرِ اوّل کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قرآنی نظام کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ (طلوعِ اسلام: جون ۱۹۶۶ء، ص ۷۸)

⑤ پورے عالم اسلام میں ادارہ طلوعِ اسلام ہی وہ واحد ادارہ ہے جس نے چاروں طرف سے چھائی ہوئی مایوسیوں میں مسلمانوں کو پکارا اور بتایا کہ ان کی ذلت و رسوائی کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی کتاب اور اس عطا فرمودہ روشنی سے دور جا پڑے ہیں۔ مسلمانوں کی باز آفرینی کے لئے یہی ایک صورت ہوسکتی ہے کہ جس طرح خدا کی دی ہوئی روشنی نے اس قوم کو آج سے چودہ سو سال پہلے ترقی اور عروج کے بامِ ثریا تک پہنچا دیا تھا۔ یہ قوم پھر اُسی مینارۂ نور سے کسبِ ضیا سے کرے اور اپنی زندگی کو اسی قالب میں ڈھال لے۔ ادارہ طلوع اسلام قریب تیس سال سے قرآن کریم کی آواز کو بلند کررہا ہے۔

(طلوعِ اسلام: جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۷۳)

چنانچہ ایک مقام پر 'مفکرِ قرآن' اپنے منہ آپ میاں مٹھو بنتے ہوئے، اپنے حلقہ احباب کو یہ باور کرواتے ہیں کہ

۶۔ اس وقت ملک میں خالص فکری تحریک صرف آپ کی ہے، باقی سب وقتی ہنگامہ آرائیاں ہیں، جن میں اسلام کا نام لیا جاتا ہے، جیسے خطوں کی پیشانی پر ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے، لیکن نفس مضمون سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ (طلوعِ اسلام: دسمبر ۱۹۶۷ء، ص ۵۲)

۷۔ اس وقت ساری دنیا میں صرف آپ کی یہ مختصر سی جماعت ہے، جو پیغام خداوندی کی مئے بے درد و صاف کو شفاف اور بے رنگ پیمانوں میں پیش کر رہی ہے۔

(طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۹ء، ص ۶۸)

ایک اور مقام پر خود نمائی اور خود ستائی کے ساتویں آسمان پر محوِ پرواز کرتے ہوئے 'مفکر قرآن' یوں تسلی آمیز انداز میں فرماتے ہیں:

''ہمارے ہاں، نہ کوئی ایسا صاحبِ فکر نکلا جو یہ سوچ سکے کہ قوم کی یہ حالت کیوں ہوگئی اور نہ

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid

کوئی ایسا صاحبِ عمل جو اس بے راہ ہجوم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے راستہ پر لگا دے۔ سارے ملک میں لے دے کے، ایک طلوعِ اسلام کی آواز تھی (اور ہے) جو صحرا میں کھوئے ہوئے اس کارواں کے منتشر افراد کے لئے بانگِ دراتھی۔'' (طلوع اسلام: اکتوبر ۱۹۷۱ء، ص ۵۱)

چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے 'طلوعِ اسلام' نے بھی اپنے قارئین کو اس فریبِ یقین میں مبتلا کیا کہ ''آؤ لوگو! یہیں نورِ خدا پاؤ گے!''

''اس وقت ،ملک جن ہنگامی حالات سے دوچار ہے، ان میں قوم کو قرآنی راہنمائی کی اشد ضرورت ہے اور یہ راہنمائی اُسے طلوعِ اسلام کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل رہی ہے۔''

(طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۴۵)

راہنمائی قرآن کی یا تہذیبِ مغرب کی؟

حالانکہ جس چیز کو 'مفکرِ قرآن' اور طلوعِ اسلام، قرآنی راہنمائی قرار دیتے ہیں وہ قطعاً اور ہرگز ہرگز قرآنی راہنمائی نہیں ہے، بلکہ وہ صرف مارکسی اشتراکیت ہے جس پر قرآنی ٹھپہ لگا کر مغربی معاشرت کے عادات و اطوار کے ساتھ اُسی طرح ملا کر پیش کیا گیا ہے، جس طرح اکبر بادشاہ نے مذاہبِ شتّٰی کے بے جوڑ عناصر کو ملا کر 'دین الٰہی' بنا کر پیش کیا تھا۔

ایمان بالقرآن کے دعاوی پرویز

جہاں تک 'مفکر قرآن' کے ایمان بالقرآن کا تعلق ہے تو اس کی اصل حقیقت ذلك قولهم بأفواههم سے زیادہ نہیں ہے، وہ اگرچہ اپنے ایمان بالقرآن کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے اور قرآنِ کریم ہی کو واحد اتھارٹی اور سند قرار دیا کرتے تھے، لیکن عملاً اُن کے ہاں سند و معیار علماے مغرب کی تحقیقات ہی تھیں۔ نظریاتی اور قولی و قلمی حیثیت سے ایمان بالقرآن کی بابت اُن کے بلند بانگ دعاوی کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اقتباسات میں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ صحت و سقم کا معیار میزانِ قرآنی ہے نہ میرا دعویٰ، نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی میری گذارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اُسے کہو کہ اس کے لئے قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔

(طلوعِ اسلام: مئی ۱۹۵۲ء، ص ۴۸)

۲۔ ہمارے نزدیک دین کا معیار فقط کتاب اللہ ہے، خواہ اس کی تائید میں ہزار حدیثیں بھی

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid

ایسی کیوں نہ پیش کردی جائیں، جن کے راویوں میں جبرائیل و میکائیل تک کا بھی نام شامل کردیا گیا ہو۔ (طلوعِ اسلام: نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۳۷)

۳۔ صحیح اور غلط کے پرکھنے کا ایک ہی معیار ہے یعنی یہ کہ اس کے متعلق قرآن کا کیا فیصلہ ہے۔ جسے قرآن صحیح قرار دے، وہ صحیح ہے خواہ اُسے ایک آدمی بھی صحیح نہ مانتا ہو، اور جسے وہ غلط قرار دے، وہ غلط ہے خواہ اُسے ساری دنیا مسلمہ کی حیثیت سے جانتی ہو۔

(طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۴ء، ص ۲۵)

۴۔ قانون کے صحیح ہونے کی سند نہ زید ہے نہ بکر، نہ اسلاف ہیں نہ اخلاف۔ اس کی سند ہے اللہ کی کتاب جو اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے خواہ اسے کسی کی بدنیتی یا نادانی، کسی بڑی سے بڑی ہستی کی طرف بھی منسوب کیوں نہ کردے۔

(طلوعِ اسلام: مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۹)

۵۔ سوال یہ ہے کہ کسی چیز کے 'درحقیقت صحیح' ہونے کا معیار کیا ہے؟ قرآن کی رُو سے وہ معیار یہ ہے کہ جو بات کتابِ خداوندی کے مطابق ہو، وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ غلط ہے۔ (طلوعِ اسلام: ستمبر ۱۹۵۹ء، ص ۶)

۶۔ کسی بات کے لئے اسلامی یا غیراسلامی ہونے کے لئے کسی انسان کی سند کافی نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے سند صرف خدا کی کتاب کی ہونی چاہئے۔

(طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۵۸)

۷۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے، جس کی روشنی میں ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ کسی اور انسان نے کہا ہے (خواہ وہ اس وقت موجود ہے یا ہم سے پہلے گزر چکا ہے) اسے پرکھے۔ اگر وہ اس کتاب کے مطابق ہے تو اسے صحیح تسلیم کرلیا جائے، اگر اس کے خلاف ہے تو مسترد کردیا جائے۔ (طلوعِ اسلام: جون ۱۹۶۷ء ص ۶۲)

۸۔ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے، صحیح ہے۔ (طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، ص ۶۰)

۹۔ دین کے معاملہ میں حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار قرآنِ کریم ہے۔

(شاہکارِ رسالت، گذرگاہ خیال: ص ۳۹)

© rasailojaraid

۱۰۔ ہمارے سامنے ہدایت وضلالت کا معیار قرآنِ مجید ہے۔

(طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۳۱)

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ !!

'مفکرِ قرآن' کے وسیع لٹریچر میں سے مُشتے نمونہ از خروارے کے طور پر یہ وہ چند اقتباسات ہیں جن میں فقط قرآن ہی کے واحد معیار، اسی کے تنہا سند ہونے اور اسی کے پیمانۂ ردّ وقبول اور اسی کے کسوٹی حق و باطل ہونے اور اسی کے فرقانِ صحت وسقم ہونے اور اسی کے میزانِ ہدایت و ضلالت ہونے کے خوش کن دعاوی مرقوم ہیں۔ ان 'خوش کن دعاوی' کی حیثیت دراصل کسی بد دیانت اور فریب کار تاجر کی دکان میں موجود اُن اصلی اور کھری چند اشیا کی سی ہے جنہیں وہ اپنے جعلی اور کھوٹے سروسامان کی بہتات میں مصلحتاً رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ اعلانات 'مفکرِ قرآن' کے فی الواقع ہاتھی کے وہ دانت ہیں جو صرف دکھانے ہی کے کام آتے ہیں۔

دنیا میں ہر شخص اچھے سے اچھا خیال، بہتر سے بہتر نظریہ، خوب سے خوب تر فکر، مستحسن سے مستحسن تر فلسفہ ہر وقت پیش کرسکتا ہے، لیکن زمانے کا بے رحم صراف، ایسے کسی خیال، نظریے، فکر یا فلسفے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جو عمل کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ ہمارے 'مفکرِ قرآن' کے یہ سب خوش کن دعاوی اس وقت بے وقعت اور بے وزن ہوکر رہ جاتے ہیں جب وہ مسائل حیات کے حل کے لئے قرآنِ کریم کی بجائے مغربی تحقیقات کی طرف یہ کہتے ہوئے رجوع فرماتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ تو تقلیدی جمود کا شکار ہے جسے دیکھ کر اُن جیسے 'نابغہ عصر' اور 'مجتہدِ مطلق' کو بڑی کوفت ہوتی ہے اور پھر یہی کوفت ان الفاظ کا روپ دھار لیتی ہے:

''سلیم ! تمہیں اپنا سینہ چیر کر درد وکرب کی ان تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنھوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ سلیم !

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالہ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

© rasailojaraid

تم نہیں دیکھ سکتے کہ میں پاکستان کے وسیع وعریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ

نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق ☆

اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

('سلیم کے نام': ج ا رص ۵۱)

اطاعتِ قرآن کی بجائے تقلیدِ مغرب

چنانچہ ہمارے 'مفکرِقرآن' صاحب جو اُمتِ مسلمہ کو کیفیتِ جمود اور حالتِ تقلید میں دیکھ کر ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہو جایا کرتے تھے کہ ''آہ! محکومی وتقلید و زوالِ تحقیق''، وہ تفسیر قرآن کی کوہ کنی میں ''اپنے دیدۂ تر کی بے خوابیوں کو''، ''اپنے پوشیدہ دل کی بے تابیوں'' کو، ''اپنے نالۂ نیم شب کے نیاز'' کو اور اپنی ''خلوت و انجمن کے گداز'' کو وقف ِراہِ تقلید مغرب کئے ہوئے تھے۔ کیونکہ مغرب میں 'زوالِ تحقیق' کی بجائے 'عروجِ تقلید' موجود ہے۔ وہ قرآنی حقائق کی بجائے، تحقیقاتِ مغرب کو حتمی، قطعی اور یقینی قرار دیا کرتے تھے۔ وہ 'ابہاماتِ قرآن' کو تہذیبِ غالب کے انکشافات و اکتشافات کی روشنی میں کھولا کرتے تھے، جہاں کہیں وہ قرآنی حقائق اور مغربی تحقیقات میں ٹکراؤ ہوتا تھا، وہ وہاں تحقیقاتِ مغرب کو شرفِ تقدم عطا کرکے قرآنِ کریم کو اُن کے مطابق ڈھال دینے پر جت جایا کرتے تھے تاکہ خدا کی کتاب 'جدید تقاضوں سے ہم آہنگ' ہو جائے اور کوئی نہ کہہ سکے کہ از منۂ مظلمہ میں نازل ہونے والی یہ کتاب آج کے 'روشن دور' کی 'علم وبصیرت' کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی۔

اس امر کے اثبات میں اگرچہ متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن مقالے کی تنگ دامنی کے باعث چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

پہلی مثال: انسانوں میں تصورِ خدا کیسے پیدا ہوا؟

بنی نوع انسان میں خدا کا تصور، عقیدۂ اُلوہیت اور ایمان باللہ کا نظریہ کیسے پیدا ہوا؟

☆ خود پرویز صاحب جس 'لذتِ کردار' کے مالک تھے، اُسے جاننے کے لئے میری کتاب ''جناب غلام احمد پرویز: اپنے الفاظ کے آئینے میں'' کا مطالعہ فرمائیے اور اُن کے 'افکارِعمیق' سے واقفیت پانے کے لئے میری جملہ کتب اور بالخصوص 'تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ' کا مطالعہ فرمائیے۔

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid

اس سوال کا واضح اور اطمینان بخش جواب از روے قرآن یہ ہے کہ ایسا وحیٔ خداوندی کی بنا پر ہوا۔ لیکن ہمارے 'مفکرِ قرآن' کی عقل و دانش اور 'قرآنی بصیرت' اس کا کوئی اور ہی جواب فراہم کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے یہ جواب:

''جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر آتش باری کرنے والا ایک عظیم اور مہیب گولہ، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، ادھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں، یہاں وہاں کف بردہاں اور سیلاب در آغوش دریاؤں کی خوف سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدہے، کبھی بادل کی لرزہ خیز گرج، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا ہجوم و اژدہام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یارو مددگار اور بے سروسامان تنہا ابن آدم۔ آپ سوچیے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق اس کا ردّعمل اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ جو بلا سامنے آئے، یہ گڑگڑانا شروع کردے۔ جہاں کوئی خطرہ آنکھ دکھائے یہ اس کے سامنے سرنگوں ہوجائے۔ اس طرح فطرت کی مختلف قوتیں اس کا 'اِلٰہ' اور یہ اس کا پرستار بن گیا۔ چاند، سورج، ستارے، گرج، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر، حتیٰ کہ وبائی امراض، سب دیوی دیوتا تصور کرلئے گئے اور ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز، منت و سماجت اور مدح و ستائش سے اُنہیں خوش رکھنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا (اُس ماحول میں) انسان کا اوّلین ردّعمل۔ خارجی کائنات کے متعلق رفتہ رفتہ اسی ردّعمل نے مذہب کی شکل اختیار کرلی اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ یا تصور مذہب کی شکل اختیار کرلے تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی، چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب کائنات کے متعلق انسان کے اس اوّلین ردّعمل کے مظاہر ہیں۔'' ('اسلام کیا ہے؟' ص ۱۹۴)

'مفکرِ قرآن' کا قطعی خلافِ قرآن فلسفہ

'مفکرِ قرآن' کا یہ اقتباس اس امر کو واضح کردیتا ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا عقیدہ توحید سے نہیں بلکہ نظریۂ شرک سے کی تھی۔ یہ نظریہ دراصل دین بیزار، اسلام دشمن، توحید مخالف اور دہریت پسند قوموں کا فلسفہ ہے جسے اُنہوں نے 'خدا سے بیزار عقل' کی کسوٹی پر پرکھ

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid

کر پیش کیا ہے اور ہمارے 'مفکرِ قرآن' نے اپنی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کی بنا پر اسے من وعن قبول کرلیا ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے سفر حیات کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں عقیدۂ توحید کی روشنی میں کی تھی نہ کہ کفر وشرک کی ظلمت میں۔ انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کی رہنمائی کرنا خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں بکثرت مقامات پر خدائے قدوس کی اس ذمہ داری کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

﴿وَعَلَى اللهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ﴾ (النحل:۹)

''اور راہِ راست دکھانا اللہ ہی کے ذمہ ہے جب کہ ٹیڑھے راستے میں موجود ہیں۔''

﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴾ (اللیل:۱۲)

''اور ہم پر ہی یہ لازم ہے کہ ہم رہنمائی کریں۔''

اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا انسان جو پیدا کیا تو اسے علم وحی سے نوازا۔ مرتبۂ نبوت عطا فرمایا تاکہ وہ علم کی روشنی میں، نہ کہ جہالت و بے خبری کی تاریکی میں، اپنے سفر حیات کا آغاز کرے۔

تنقید بر 'دلائل پرویز'

اپنے 'مفکر قرآن' کے وہ دلائل جو اُنہوں نے 'خارجی کائنات' کے متعلق انسان کے اوّلین ردّعمل کے ضمن میں پیش کئے ہیں تو وہ دراصل 'دلائل' نہیں بلکہ دانشورانِ مغرب کی چچوری ہوئی وہ ہڈیاں ہیں جنہیں منکرین حدیث اپنے منہ سے اُگل رہے ہیں اور حیرت بالائے حیرت یہ امر ہے کہ تہذیبِ مغرب کے سحر میں گرفتار یہ غلام فطرت لوگ اپنی اسلامی حس اور تنقیدی قوت کو سرے سے ہی کھو چکے ہیں یہاں تک کہ مغرب سے جو کچھ بھی آتا ہے، اُسے وحی سمجھ کر من وعن قبول کرلیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال اسی زیر بحث معاملہ میں دیکھی جاسکتی ہے کہ انسانی دنیا میں خدا اور مذہب کے تصور کی پیدائش میں کس طرح فلاسفۂ مغرب کی اندھی تقلید کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کو محض خوف کی 'پیداوار' قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ کاروانِ انسانیت کے سفر کا آغاز علم وحی کی روشنی میں نہیں بلکہ جہل و بے علمی کی تاریکی میں ہوا تھا اور نہیں معلوم کہ سفر ارتقا کی کتنی منزلیں طے کر ڈالنے کے بعد اور مدتِ دراز کی کشتی ٹھوکریں کھانے کے بعد اس

© rasailojaraid

کارواں کو توحید و اسلام کی روشنی دکھائی دی۔ یہ سب کچھ دراصل اسلامی فلسفۂ تاریخ سے قطعی جہالت و ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور ساتھ ہی فلسفۂ مغرب سے شدید فکری مغلوبیت اور ذہنی مرعوبیت کا بھی۔ بیدار مغز مسلم مفکرین نے جنہیں تہذیبِ مغرب کی چمک دمک متاثر نہ کرسکی، اپنی جاندار تنقید سے مغربی فلسفہ کے تاروپود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے درج ذیل اقتباس......مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ بات کہ مذہب کا آغاز اَن دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا ہے اور یہی جذبہ انسان کے جذبات میں اوّلین اور قدیم جذبہ ہے، بالکل بے سروپا ہے۔انسانوں میں جو خوف پایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت، زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے۔خود کا تجزیہ کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے اس چیز کا کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اُس سے محروم ہوجانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہوگیا ہے جو آپ کو حاصل بھی ہے اور عزیز بھی۔مثلاً انسان کو اپنی زندگی عزیز ہے، زندگی کا سروسامان عزیز ہے، اپنے بیوی بچے عزیز ہیں۔ اس لئے وہ ان چیزوں کی طرف سے اندیشہ میں ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں چھن نہ جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور بھی لازمی ہوا اور پھر اس کی شکرگزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔

اس نظریہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں، وہ دنیا کے عام واقعات میں سے نہیں۔ زلزلے روز نہیں آیا کرتے، آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں، وبائیں روز نہیں پھوٹتیں اور طوفان کا شور بھی کوئی روزمرہ کا واقعہ نہیں۔ اس کے برعکس تارے روز چمکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، چاند روز چمکتا ہے اور اپنی روپہلی چاندنی کی چادر روز دشت و جبل میں بچھاتا ہے۔ آسمان کی نیلگونی ہر لحہ باصرہ نوازی کرتی ہے۔ابرِکرم کی تردستیاں اور درختوں کی ثمرباریاں ہرموسم میں موجود رہتی ہیں۔ پھر کس قدر حریت کی بات ہے کہ مظاہر فطرت کی گاہ گاہ کی گھرکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کردیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے، لیکن منعم غیب کی ساری فیاضیاں بالکل بے اثر ہوکر رہ جائیں اور انسان میں شکر وسپاس کا کوئی ولولہ پیدا نہ کریں۔اس لئے انسان کے مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ النفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے

© rasailojaraid

مشاہدہ سے اس پر ایک منعم حقیقی کی شکرگزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا اور پھر اس جذبہ کی تحریک سے وہ اُس کی بندگی کی طرف مائل ہوا، گویا دین کا آغاز توحید سے ہوا، اس میں کجی پیدا کرکے شرک کی راہ انسان نے بعد میں اختیار کی۔'' (فلسفے کے بنیادی مسائل: ص ۳۵)

ہمارے 'مفکر قرآن' چونکہ ذہناً اور کلیاً فلسفہ سے مرعوب و مسحور تھے۔ اس لئے وہ مقہور و مجبور تھے کہ اس سوال کے جواب میں کہ بنی نوع انسان میں خدا کا تصور کیسے پیدا ہوا؟ وہی فلسفہ اپنائیں جس کی روشنی میں اہل مغرب کے ہاں انسان کا سفر حیات (توحید کی روشنی میں نہیں بلکہ) شرک و کفر کی تاریکیوں میں ہوا تھا اور پھر اسی فلسفۂ باطلہ کی لاج رکھتے ہوئے، اُنہوں نے اپنی فکری مرعوبیت اور ذہنی غلامی کا کھلا کھلا ثبوت فراہم کر ڈالا ہے۔ یہ طرزِ عمل خود اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ 'مفکرِ قرآن' کس طرح قرآن کا نام لے کر، فکرِ فرنگ اور فلسفۂ مغرب کی پیروی کیا کرتے تھے۔

عمر بھر کے مطالعۂ قرآن کے بعد بھی قرآن سے بے خبری

'مفکرِ قرآن' اپنی ستائش آپ کرتے ہوئے اکثر اپنی عمر بھر کی قرآنی تحقیق و ریسرچ کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے، مثلاً

''میں، اے برادرانِ گرامی قدر! قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں، میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس کتابِ عظیم کی روشنی میں اپنی بصیرت کے مطابق اسلام کے بنیادی تصورات کا مفہوم متعین کرنے میں صرف کیا ہے اور میری اس کوشش کا ماحصل، میری تصانیف کے اَوراق میں محفوظ ہے۔'' (طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۷۳ء، ص ۲۷)

''مہ و سال کے شمار سے میں ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو اپنی عمر رواں کے پچھتّر سال پورے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں تھا جس کا خصوصیت کے ساتھ طلوعِ اسلام کے صفحات میں ذکر کیا جاتا۔ قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں پچاس سال پورے کر رہا ہوں۔ عام اصطلاح میں اسے 'گولڈن جوبلی' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ پچاس سالہ 'جوبلی' دنیا کے ہر متاع سے زیادہ گراں مہا اور اس کی یاد، سب سے زیادہ وجہِ نشاطِ روح ہے اور نشاط و انبساط کے یہی وہ احساسات ہیں جن میں اپنے بے شمار دیدہ و نادیدہ اَحباب و رفقا اور متفقین کو شریک کرنے کے لئے میں نے اس

© rasailojaraid

کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے۔ میں جب ساحلِ عمر کے ریگِ رواں پر ان پچاس سالہ نقوش کو مرتسم دیکھتا ہوں تو حیرت میں جو متن اپنے سامنے رکھا تھا، اس میں مجھے اس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس سے میرا سرنیاز اس بارگاہِ عتبۂ عالیہ پر بے ساختہ جھک جاتا ہے جس کی عطا کردہ راہنمائی کے بغیر اس کامیابی کا عشرعشیر بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا اور حیرت یہ کہ تمام دنیاوی علائق کے باوجود (جن میں کم وبیش تیس سال ملازمت کے بھی شامل ہیں) میں نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں تن تنہا یہ طویل مسافت کیسے طے کرلی۔''

(طلوعِ اسلام: جولائی ۱۹۷۸ء، ص۶)

بلاشبہ 'مفکرِ قرآن' نے قرآنی مطالعہ وتحقیق میں پچاس سال صرف کرڈالے، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ وہ لغت ہائے حجازی کے قارون تو بن گئے، لیکن قرآن کی روح اُن پر بے نقاب نہ ہوسکی، کیوں؟ صرف اس لئے کہ ان کی آنکھوں پر ایک مخصوص رنگ کی عینک چڑھی ہوئی تھی، اور دورانِ مطالعہ انہیں ہر چیز اُسی عینک ہی کے رنگ میں دکھائی دیتی رہی اور قرآنِ کریم کی وہ واضح آیات جو فکرِ مغرب کی تردید کرتے ہوئے یہ اعلان کرتی ہیں کہ کاروانِ انسانیت نے اپنا سفر، کفروشرک اور جہالت وبے علمی کی تاریکیوں میں نہیں بلکہ عقیدۂ توحید اور علم وحی کی روشنی میں شروع کیا تھا، اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہیں۔ صرف دو آیات ملاحظہ فرمائیے:

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا﴾ (یونس:۱۹)

''اور لوگ تو ایک ہی اُمت تھے پھر اُنہوں نے اختلاف کیا۔''

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ﴾

''(ابتدا میں) سب کچھ لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو مبشر اور منذر تھے۔'' (البقرۃ:۲۱۳)

یہ دونوں آیات فکرِ پرویز کی تردید کرتی ہیں جو اُنہوں نے 'مفکرِ قرآن' کی حیثیت سے مغرب سے اپنی ذہنی مرعوبیت کے باعث اپنا رکھا تھا۔ پہلی آیت کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''ضمناً اس سے جدید فلسفیوں کے اس نظریہ کی بھی تردید ہوگئی کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا، پھر درجہ بدرجہ اِرتقا کرتے ہوئے توحید تک پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ خدا نے شروع ہی سے انسان کو توحید کی تعلیم دی، لیکن گمراہوں نے اس میں اختلاف پیدا

© rasailojaraid.

کرکے فتنے کھڑے کردیئے۔ہم نے فلسفۂ جدید کے اس باطل نظریہ کی تردید اپنی کتاب 'حقیقتِ توحید' میں تفصیل سے کی ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد۴ص ۳۵)

اور دوسری آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں:

''آیت نے ایک بڑی گرہ کھول دی۔فرنگی 'محققین' حسبِ معمول مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے اور ان میں اکثر یہی کہے گئے کہ انسان کا ابتدائی مذہب شرک یا تعددِ آلہہ تھا۔شروع شروع میں وہ ایک ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا اور عقیدۂ توحید تک نسلی انسانی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد اور عقلی اور دماغی ارتقا کے بڑے طویل سفر کے بعد پہنچی ہے۔قرآنِ مجید نے اس خرافی نظریہ کو ٹھکرا کر صاف اعلان کردیا کہ نسلِ انسانی آغازِ فطرت میں دینی حیثیت سے ایک اور واحد تھی۔ اس میں 'مذہب' و 'اَدیان' کے یہ تفرقے کچھ بھی نہ تھے۔امتِ واحدہ میں جس وحدت کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ اس سے دینی واعتقادی وحدت ہی مراد ہے:

كانوا على شريعة من الحق (ابن جریر،عن ابن عباس)

إنهم كانوا على دين واحد وهو الإيمان والحق هذا قول أكثر المحققين (تفسیر کبیر)

صدیوں کی اُلٹ پھیر اور قیل وقال کے بعد اب آخری فیصلہ بڑے بڑے ماہرین اثریات، انسانیات و اجتماعیات (سرچارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن اور پروفیسر شمڈٹ) کا یہی ہے کہ انسان کا اوّلین دین، دینِ توحید تھا۔'' (تفسیر ماجدی: صفحہ۸۳، حاشیہ ۷۷۲)

'مفکرِ قرآن' کی اندھی تقلید مغرب

لیجئے، اب تو مغربی مفکرین بھی اپنی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسان کا اوّلین دین، دینِ توحید تھا۔لیکن ہمارے 'مفکرِ قرآن' ماڈرن ہوکر بھی ابھی تک اس مسئلہ میں 'قدامت پرستی' پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ دراصل 'مفکرِ قرآن' صاحب یہاں کے اس جدید طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ذہنوں پر مغرب کی اندھی پیروی کے باعث ایسا جمود و تعطل طاری ہوگیا ہے کہ اگر وہاں سے کوئی غلط بات بھی صادر ہوجائے تو اُسے 'وحی' قرار دے کر ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا ہے اور مسائلِ حیات کے حل کے لئے پوری مقلدانہ سعادت مندی کے ساتھ اُن ہی نسخوں کو آزما ڈالا جاتا ہے جو دراصل یہاں کے لئے بنائے ہی نہیں گئے تھے۔

© rasailojaraid

اہل مغرب دورِ حاضر کی غالب تہذیب کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے اپنے مجوزہ نسخوں کو مجتہدانہ بصیرت سے برتتے ہیں اور حسبِ ضرورت ان میں ترمیم بھی کرلیتے ہیں، لیکن یہاں کے مقلد تو ایسے کورچشم واقع ہوئے ہیں کہ اپنے وطن، ماحول، حالات، الغرض ہر چیز سے آنکھیں بند کرتے ہوئے مریض کی آخری ہچکی تک وہی نسخہ استعمال کرتے رہیں گے، اِلا یہ کہ خود وہیں سے ترمیم کی کوئی اطلاع آجائے۔ لیکن بعض ضدی قسم کے عطائیوں کا تو یہ حال ہے کہ جس غلط بات کو ایک مرتبہ تقلیدِ یورپ میں اختیار کرلیا ہو، اُسے پھر دانتوں سے پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بعدازاں اب اگر وہاں کے مفکرین کی تحقیقات میں بھی وہ غلط قرار دی گئی ہو تو بھی یہاں کے مقلدین اس کی تردید و تکذیب پر آمادہ نہیں ہوتے۔ فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا من قبل !

اب یہاں دیکھئے، مفکرینِ مغرب مثلاً سرچارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن اور پروفیسر شمڈٹ وغیرہ اپنی جدید تحقیقات کے باعث سابقہ نظریہ کو ترک کرکے اس تحقیق و انکشاف پر متفق ہو رہے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کا آغاز کفر و شرک کی ظلمتوں اور جہالت و بے خبری کی تاریکیوں میں نہیں کیا بلکہ عقیدۂ توحید اور علم وحی کی روشنی میں کیا تھا، لیکن ہمارے ہاں تجدد پسند دانشور ابھی تک مغرب کی پرانی تحقیق پر جمے ہوئے ہیں جو صریحاً خلافِ قرآن ہے۔

دوسری مثال: انکارِ نبوتِ آدم:

ملتِ اسلامیہ کا چودہ صدیوں پر محیط لٹریچر اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ہر دور کے مفکرین و مجتہدین، مفسرین و محدثین، علماء و فقہا، موٴرخین و اصحابِ سیر نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ایک برگزیدہ پیغمبر اور نبی تسلیم کیا ہے، لیکن ہمارے 'مفکر ِقرآن' اُنہیں نبی تسلیم نہیں کرتے اور اس کے لئے بایں الفاظ دلیل پیش کرتے ہیں :

> ''سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قصۂ آدم میں کہا گیا ہے کہ خدا نے آدم کو بالتصریح ایک حکم دیا اور آدم نے اس سے معصیت برتی، اس قسم کی معصیت کسی نبی کا شیوہ نہیں ہوسکتا......حضرات انبیا تو رہے ایک طرف، جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، ابلیس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ ﴾ (۴۲/۱۵) ''یقیناً میرے بندوں پر تجھے

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid

غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔'' (تفسیر مطالب الفرقان: ج۲/ص۶۳)

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں:

اوّلاً یہ کہ ...... آدم علیہ السلام کی یہ معصیت تھی کس قسم کی؟ جس کے متعلق خود پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ ''اس قسم کی معصیت، کسی نبی کا شیوہ نہیں ہوسکتی۔''

حقیقت یہ ہے کہ آدم علیہ السلام، نہ تو معصیت کوش تھے اور نہ ہی نافرمانی ربّ کا وہ کوئی ارادہ رکھتے تھے۔ بات صرف یہ ہوئی کہ بقول پرویز صاحب:

''﴿وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّصِحِينَ﴾ ''شیطان نے قسمیں کھا کر کہا: جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہاری خیر خواہی کے لئے کررہا ہوں۔'' (مفہوم القرآن: آیت ۷/۲۱)

اور حضرت آدم علیہ السلام جن کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی فرد اللہ کے نام کی قسم کھا کر کسی کو دھوکہ دے سکتا ہے، اپنی فطری سادگی کی بنا پر اس شیطانی چکمہ کا شکار ہوگئے، پھر یہ دھوکہ دہی کی واردات بھی پہلی ہی تھی کہ اس سے قبل اُنہیں کبھی کسی فریب دہی اور دھوکہ بازی کی صورتِ حال کا سامنا نہ ہوا تھا، بلکہ اس وقت تک آدم علیہ السلام اپنی فطرت کی سادگی اور پاکیزگی پر قائم تھے کہ جھوٹ، دھوکہ اور فریب جیسے رذائل سے ان کا تعارف ہی نہ ہوا تھا۔ اس لئے وہ شیطان کے فریب میں آ گئے پھر کیا حضرات انبیا، عالم الغیب ہوتے ہیں کہ کسی بدباطن کے دھوکہ میں نہ آئیں؟ کیا یہ واقعی اس قسم کی معصیت تھی جس سے انبیاے کرام بالاتر ہوا کرتے ہیں؟ آخر وہ کسوٹی اور معیار تو بیان کیا جاتا جس کی رو سے انبیا کی معصیت اور غیر انبیا کی معصیت میں فرق کیا جاسکے۔

لغزشِ یونس اور پرویز

پھر از روے قرآن حضرت یونس علیہ السلام سے جو کچھ سرزد ہوا، کیا وہ آدم علیہ السلام کی لغزش سے بڑی لغزش نہ تھی، حالانکہ نبوتِ یونسؑ کے خود پرویز صاحب بھی قائل ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''...... وہ قوم کی مخالفت سے سخت گھبرا گیا اور پیشتر اس کے کہ اسے خدا کی طرف سے ہجرت

© rasailojaraid

کرنے کا حکم ملتا، وہ اپنے فرائض منصبی کو چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہوگیا......''

(برقِ طور: ص۲۸۹)

پھر ایک اور مقام پر حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش کی وضاحت بایں الفاظ کرتے ہیں:

''خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم، اُس وقت ملا کرتا ہے جب اس قوم کا حق وصداقت کو قبول کرنے کا اِمکان باقی نہ رہے۔ اس سے پہلے وہاں سے چلے جانا گویا اپنے فرائضِ منصبی کو چھوڑ دینا ہے۔ یہی یونس علیہ السلام کی اجتہادی غلطی تھی۔'' (برقِ طور: ص۲۸۹،۲۹۰)

اب غور فرمائیے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ان کی اپنی طرف سے بغیر کسی 'ناصح' کی پھسلاہٹ کے واقع ہوا، اور اُنہوں نے بطن ماہی میں لَا اِلٰهَ اِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کہہ کر اعترافِ لغزش بھی کیا اور معافی بھی مانگی۔

دوسری طرف، حضرت آدم علیہ السلام سے جو کچھ واقع ہوا، وہ ان کی آزادانہ مرضی کا نتیجہ نہ تھا۔ ابلیس کے اس فریب کا نتیجہ تھا جو اس نے ناصح وشفیق کا روپ دھار کر خدا کی قسمیں کھا کر دیا تھا۔ اگر ابلیس اُنہیں یہ چکمہ نہ دیتا تو ان سے یہ امر سرزد ہی نہ ہوتا۔ بخلاف ازیں حضرت یونس علیہ السلام سے جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اس میں ابلیس یا کسی اور 'شفیق ناصح' کا عمل دخل تھا ہی نہیں، لیکن ہمارے 'مفکرِ قرآن' حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''اس قسم کی معصیت کسی نبی کا شیوہ نہیں ہوسکتا'' یعنی کسی کی قسموں پر اعتبار کرکے اسے شفیق ناصح جان کر اگر کسی سے لغزش ہوجائے تو یہ تو نبی کا شیوہ نہیں ہوسکتا، لیکن اگر کسی نبی سے ایسے حکم خدا کی نافرمانی ہوجائے جو سب انبیا کے لئے ہجرت کے لئے ایک مستقل ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے تو ایسی نافرمانی ''نبی کا شیوہ ہوسکتی ہے۔'' قربان جائیے 'مفکر قرآن' کی اس 'قرآنی فہم وبصیرت' کے!

ثانیاً یہ کہ...... پرویز صاحب کا یہ استدلال کہ...... ''شیطان نے آدم پر غلبہ پالیا جبکہ نبی تو رہا ایک طرف وہ اللہ کے مخلص بندوں پر بھی حاوی نہیں ہوسکتا۔'' از حد لغو استدلال ہے، جو 'مفکرِ قرآن' کے غلبۂ شیطان کی حقیقت سے بے بہرہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

© rasailojaraid.

غلبۂ شیطان یا مسِ شیطان؟

غلبۂ شیطان کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے جملہ اُمور میں نہیں تو اکثر و بیشتر معاملات میں شیطان کا پیرو بن جائے اور شیطان کو اس پر اس قدر قابو حاصل ہو جائے کہ وہ راہِ راست پر نہ رہنے پائے، رہا کسی ایک آدھ معاملے میں، شیطانی وسوسہ یا ابلیسی نسیان کا شکار ہو جانا، تو اسے غلبۂ شیطان سے تعبیر کرنا سوئے تعبیر ہے۔ اسے بیش از بیش 'مسّ شیطان' کہا جاسکتا ہے، چنانچہ قرآن مجید خود 'غلبۂ شیطان' اور 'مسِ شیطان' میں فرق کرتا ہے۔ وہ اوّل الذکر کے متعلق یہ کہتا ہے کہ إِنَّ عِبَادِى لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ (۱۵/۴۲) ''یقیناً میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔'' اور 'مس شیطان' کے بارے میں خود قرآنِ کریم ہی میں یہ مذکور ہے کہ اہل تقویٰ حضرات بھی بعض اوقات اس سے محفوظ نہیں رہ پاتے، تاہم خدا کی یاد جب اُن کی آنکھیں کھول دیتی ہے تو ان کی خفیہ یا مدھم بصیرت میں بیداری یا جلا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ 'مس شیطان' کے اثر سے چھٹکارا پالیتے ہیں۔ قرآن مجید اس سلسلہ میں یہ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ﴾ (الاعراف:۲۰۱)

''بے شک جو لوگ تقوی شعار ہیں انہیں جب شیطان کی طرف سے وسوسہ پہنچتا ہے اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ان کو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

جو لوگ 'غلبۂ شیطان' اور 'مسِ شیطان' میں فرق و امتیاز کی تفصیلی وضاحت چاہتے ہیں، اُنہیں چاہئے کہ وہ میری کتاب 'تفسیر مطالب 'الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ' کا مطالعہ فرمائیں۔ اس میں اثباتِ نبوتِ آدم کا تفصیلی تذکرہ بھی موجود ہے۔

انکارِ نبوت آدم علیہ السلام کی اصل وجہ؟

حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کے انکار کی اصل وجہ دراصل وہ فلسفہ تاریخ ہے جسے مغرب نے پیش کیا ہے اور پرویز صاحب اُسے دل و جان قبول کر چکے ہیں۔ نبوتِ آدم کا اقرار و اعتراف اس فلسفۂ تاریخ سے میل نہیں کھاتا جبکہ اسلامی فلسفۂ تاریخ کی رو سے آدمؑ کی نبوت کو قبول کئے بغیر چارۂ کار نہیں، کیونکہ روئے زمین پر اوّلین انسان کے ظہور پذیر ہونے

© rasailojaraid.

کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلسلۂ رشدو ہدایت کا اِجرا و آغاز ، رحمتِ خداوندی کا ویسا ہی ناگزیر تقاضا ہے جیسا انسان کی مادی ضروریات کو پورا کرنا۔

قرآن کریم کی رُو سے تخلیقِ بشر (آدمؑ) کا مقصد ہی زمین میں خلافت کے فرائض کوانجام دینا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اللہ کی مرضی اور ہدایت پر چلے۔اگر وہ خدائی رہنمائی سے انحراف کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ خلافت کی بجائے بغاوت کی راہ اختیار کرتا ہے بلکہ وہ مستحق سزا بھی ٹھہرتا ہے اور یہ سزا دنیا میں ضیقِ قلب اور آخرت میں دخولِ جہنم کی صورت میں ہوگی، لیکن اگر وہ اپنے فرائض مرضاتِ الٰہیہ کے تابع انجام دیتا ہے تو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی انعامِ خداوندی کا مستحق قرار پاتا ہے۔ آدمؑ کو زمین پر اُتارتے وقت یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دی تھیں :

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾

(طٰہٰ :۱۲۳،۱۲۴)

''اب اگر میری طرف سے تمہیں ہدایت پہنچے تو جوکوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ بھٹکے گا، نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا، تو اس کے لئے دنیا میں بھی تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز بھی ہم اسے اندھا کرکے اُٹھائیں گے۔''

چنانچہ آدمؑ جو ابوالبشر اور اولی الانسان تھے، اُسے امورِ خلافت کی انجام دہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے نورِ ہدایت سے نوازا اور مقامِ نبوت پر سرفراز فرمایا۔اس طرح انسانی معاشرہ کی ابتدا کفر و شرک اور الحاد و دہریت کی تاریکیوں میں ہونے کی بجائے توحید و رسالت اور رشد و ہدایت کی روشنی میں ہوئی۔ لیکن 'مفکرِ قرآن' کے قلب و ذہن اور حواس و مشاعر پر جو فلسفہ اپنی مضبوط گرفت قائم کرچکا ہے، اس کی رُو سے انسانی معاشرہ کی ابتدا، کفروشرک یا الحاد و دہریت سے ہوئی تھی اور پھر رفتہ رفتہ یہ معاشرہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا توحید تک پہنچا۔ اس طرح بہت بعد میں کہیں جاکر سلسلۂ وحی و رسالت آغاز پذیر ہوا۔ ابتدائی انسانی معاشرہ کے متعلق پرویز صاحب فرماتے ہیں:

© rasailojaraid

’’قوموں کے عروج و زوال میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ خارجی کائنات اور Outer Space کے بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے؟ انسان کے شعور نے جب پہلے پہلے آنکھ کھولی تو فضا اور ماحول اس کے خلاف تھا، سر پر آگ برسانے والا شعلہ، آندھیاں، جھکڑ، بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، بپھرے ہوئے دریا اور ان کے درمیان نہتا اور تنہا انسان، نہتا یوں کہ فکر و دانش میں پختگی پیدا نہ ہوئی تھی۔ وہ فطرت کی طاقتوں کے سامنے جھکنے لگا، انسان کا یہ ابتدائی مذہب (خودساختہ) خود کا پیدا کردہ تھا۔ اس وقت انسان حوادث کے اسباب وعلل سے بھی واقف نہ تھا۔ فطرت کے مظاہر ہر جگہ خدا کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔‘‘ (طلوعِ اسلام: اکتوبر ۱۹۵۹ء ص ۲۳)

علم الانسان کے اس فلسفہ کی رو سے جب انسانی معاشرہ کا آغاز مظاہر فطرت سے مرعوبیت کی بنا پر اُنہیں خدا ماننے کے صورت میں ہوا، تو ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے ابتدائی انسانی زندگی میں نبوت و رسالت اور خدائی رشد و ہدایت کو ماننے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی جسے قرآن پیدائشِ آدمؑ کے ساتھ ہی آغاز پذیر قرار دیتا ہے اور ہمارے ’مفکرِ قرآن‘ چونکہ مغربی فلسفہ و تحقیق سے بُری طرح مرعوب ومغلوب ہیں اور اہل مغرب کی فکری غلامی اور ذہنی اسیری میں مبتلا ہیں لہٰذا وہ کسی ایسی صورت حال کے قائل نہیں ہو سکتے جس میں انسانی معاشرہ کی ابتدا نور وحی اور ضیاے ہدایت میں ہونا قرار پائے، کیونکہ وحی و ہدایت کا وجود نبوت و رسالت کے وجود کو مستلزم ہے۔ ’مفکرِ قرآن‘ کی طرف سے انکارِ نبوتِ آدم کی تہہ میں یہی مغربی فلسفہ کارفرما ہے۔

وہ قرآن کے حقائق اور جدید تحقیقات میں کہیں تضاد و تصادم پائیں تو ان کا رویہ یہ نہیں ہوتا کہ قرآنی حقائق کو حتمی، قطعی اور یقینی قرار دے کر ’جدید تحقیقات‘ کو یہ کہہ کر ردّ کر دیں کہ ’’یہ تحقیقات ابھی خام ہیں، ممکن ہے مستقبل کے علمی انکشافات اُنہیں ردّ کر کے وہ چیز پیش کر دیں جو مطابق وحی ہو۔‘‘ بلکہ وہ یہ روش اختیار کیا کرتے ہیں کہ ’’قرآن کے اس مقام کی تشریح ممکن ہے کہ آئندہ کے علمی انکشافات اور آثارِ قدیمہ کے حقائق سے ہو جائے۔‘‘ اس طرح وہ ہمیشہ قرآن پر ان تحقیقات کو شرفِ تقدم بخشا کرتے تھے جو اہل مغرب نے پیش کی ہوں، انکار نبوت آدم میں بھی یہاں یہی لم کارفرما ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ’مفکرِ قرآن‘ کا راسخ ایمان قرآنِ کریم پر تھا؟ ...... یا تحقیقات مغرب پر؟‘‘